خدّام الاحمدیہ کو چاہئے کہ وہ لوگوں کے اندر قومی، تجارتی اور اخلاقی دیانت پیدا کریں

(فرمودہ ۱۷؍فروری ۱۹۳۹ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

''میرا آج کا خُطبہ بھی گزشتہ دو خطبات کے سلسلہ میں ہی ہے۔مگر پیشتر اِس کے کہ مَیں اصل مضمون کو شروع کروں مَیں قادیان کے خدام الاحمدیہ کو اِس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ مختلف مساجد کے مؤذِّنوں کی اذانیں دُرست کرائیں۔بعض جگہ پر بلا وجہ مؤذن عربی عبارت کا ایسا ستیاناس کر دیتے ہیں کہ واقف آدمی کے کانوں پر وہ بہت ہی گِراں گزرتا ہے۔مَیں نے کئی دفعہ اِس طرف توجّہ دلائی ہے مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک اِس طرف توجّہ ہوئی نہیں۔جن حروف کا ادا کرنا ہمارے لئے مُشکل ہے اُن کے متعلق ایک پنجابی سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ اہلِ عرب کے لہجہ کو ادا کرے بِالکل غلط ہے اور مَیں اِس پر زور نہیں دیتا۔مَیں صرف اِس حصّہ کی درستی کا مُطالبہ کرتا ہوں جس حصّہ کی درستی ہمارے اختیار میں ہے اور باوجود اختیار میں ہونے کے اُس کی درستی کی طرف توجّہ نہیں کی جاتی۔تو خدام الاحمدیہ کو چاہئے کہ وہ اپنے میں سے پانچ سات نوجوانوں کو جو عربی تعلیم سے واقف ہوں اذان کے الفاظ اچھی طرح واقفیت کرا دیں، اِس کے بعد مختلف مساجد میں (اور کوشش کرنی چاہئے کہ

یہ لوگ ایسے ہی ہوں جن کا تعلق مختلف مساجد سے ہو) ان کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ جو باقاعدہ مؤذن ہیں ان کی اذانوں کی اصلاح کریں اور دوسرے لوگ بھی جو باقاعدہ مؤذن نہیں اگر اُن کی کوئی غلطی دیکھیں تو انہیں ٹوک دیا کریں تا کہ انہیں اپنی اصلاح کا خیال پیدا ہو۔ مثلاً ابھی جو اذان ہوئی ہے اِس میں مؤذن نے حَیَّ کے بعد اتنا لمبا الف استعمال کیا ہے جو نہ تو جائز ہے اور نہ ہی اِس کی کوئی ضرورت ہوتی ہے مگر عام پنجابی لہجہ یہی طریق اختیار کرتا ہے اور پنجابی مؤذن حَیَّ نہیں بلکہ حَیَّا کہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے شائد اِس طرح آخر میں الف زائد کر دینے اور اِسے لمبا کر دینے سے آواز اونچی ہو جاتی ہے حالانکہ عرب لوگ بھی اذان دیتے ہیں اور وہ بغیر حَیَّـــا کہنے کے کام چلا لیتے ہیں۔ بایں ہمہ اُن کی آوازیں اتنی بلند ہوتی ہیں اور اُن کی اذان میں اپنی ذات میں ایسی مسرّت انگیز آواز کی حامل ہوتی ہے کہ وہ ایک شیریں راگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مکّہ مکرمہ میں چونکہ مؤذّن مقرر کئے جاتے ہیں اور مَیں نے دیکھا ہے اذان دیتے وقت اُن کی آوازیں اتنی دلکش اور لطیف ہوتی ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان اِس آواز کے ساتھ ہی زمین سے اُٹھ کر آسمان کی طرف جا رہا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اِس لفظ کی خوبصورتی اِلف چھوڑ دینے میں ہے اِس کے استعمال کرنے میں نہیں۔ اور جب الف اِس لفظ میں ہے ہی نہیں تو اِس کے استعمال کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ پس اگر وہ آئندہ کے لئے حَــــیَّ کے بعد الف استعمال نہ کریں تو مَیں سمجھتا ہوں ان کی اذان پہلے سے بہت زیادہ خوبصورت ہو جائے۔ اِسی طرح اور بھی بہت سے نقائص ہیں جو ہمارے پنجاب میں بوجہ عربی زبان کی ناواقفیت کے اصرار سے چلتے چلے جاتے ہیں اور مَیں خدّام الاحمدیہ کو توجّہ دلاتا ہوں کہ وہ اِس نقص کی اصلاح کی کوشش کریں۔

اِس کے بعد مَیں آج کے مضمون کو لیتا ہوں۔ گزشتہ خُطبہ میں مَیں نے خدّام الاحمدیہ کے مقاصد میں سے تین ضروری مقاصد کو لیا تھا اور بتایا تھا کہ ان کی طرف خصوصیت سے ان ایّام میں انہیں توجّہ کرنی چاہئے اور وہ یہ تھے۔

اوّل۔ انہیں اپنے ممبروں کے اندر اور دوسری جماعت کے اندر بھی قومی رُوح پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور جماعتی کاموں کے لئے قُربانی کا مادہ پیدا کرنا چاہئے۔ یہ پہلا مقصد ہے

جو اِنہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔

دوسری بات مَیں نے یہ کہی تھی کہ اسلامی تعلیم سے واقفیت پیدا کی جائے۔

تیسری بات مَیں نے یہ کہی تھی کہ آوارگی اور بیکاری کا ازالہ کیا جائے۔

اب مَیں **چوتھی بات** بیان کرتا ہوں جو یہ ہے کہ اچھے اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اچھے اخلاق میں سے مَیں نے کئی دفعہ بیان کیا ہے بہترین اخلاق جن کا پیدا کرنا کسی قوم کی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے وہ سچ اور دیانت ہیں۔ اَور بھی بہت سے اخلاق ہیں مگر سچ اور دیانت نہایت اہمیت رکھنے والے اخلاق ہیں۔ جس قوم میں سچ پیدا ہو جائے اور جس قوم میں دیانت آ جائے وہ قوم نہ کبھی ذلیل ہوسکتی ہے اور نہ کبھی غلام بنائی جاسکتی ہے۔ سچائی اور دیانت دونوں کا فقدان ہی کسی قوم کو ذلیل بناتا اور اُن دونوں کا فقدان ہی کسی قوم کو غلام بناتا ہے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ہندوستان کی غلامی کا ہمیشہ رونا روتا رہتا ہے لیکن اگر تم غور سے دیکھو تو تمہیں معلوم ہو کہ ہندوستان کی غلامی کا موجب انہی دو چیزوں کا فقدان ہے۔ تم ہندوستان کی تاریخ کو پڑھ جاؤ اتنے بڑے وسیع مُلک کا انگریزوں کے ماتحت آ جانا محض بد دیانتی کی وجہ سے تھا۔ انگریزی فوجیں جو شروع زمانہ میں بعض دفعہ سینکڑوں کی تعداد سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں کبھی ہندوستان پر غالب نہیں آ سکتی تھیں اگر ہندوستانیوں میں دیانت پائی جاتی۔ بعض دفعہ تو تاریخ پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ ساری بات ہی جھوٹی ہے اور عقل تسلیم نہیں کرتی کہ مدراس کے ایک چھوٹے سے علاقہ میں اقامت پذیر چند سَو انگریز ہندوستان کی بڑی بڑی طاقتوں اور حکومتوں کو زیر کرتے چلے جائیں۔ عقل اِس کے باور کرنے سے انکار کرتی ہے کیونکہ انسانی فطرت اِس حد تک اخلاق کی گراوٹ کو تسلیم کرنا برداشت نہیں کرتی جس قسم کی گراوٹ اِس زمانہ میں ہندوستانیوں میں پائی جاتی تھی۔ کسی جگہ پر تو شہزادوں کو رشوت دے دی جاتی ہے کہ اگر تم اپنے باپ یا بھائی سے بغاوت کرو تو ہم تم کو اِس کی جگہ گدّی پر بٹھا دیں گے اور وہ بد دیانت اور ذلیل انسان اِس رشوت کو قبول کر لیتے ہیں۔

کسی جگہ وزراء کو یہ اُمید دلا دی جاتی ہے کہ ہم تمہاری ایک ریاست قائم کر دیں گے یا تم کو اُس ریاست کا قبضہ دے دیں گے یا اَور کوئی بڑا عُہدہ دے دیں گے اور وہ ننگِ انسانیت

اِس رشوت کو قبول کر لیتے ہیں اور انہی چالبازیوں کے ساتھ اور انہی رشوتوں کے ذریعہ یورپین اقوام جو نہایت قلیل تعداد میں ہندوستان میں آئیں، ہندوستان کے ایک گوشہ سے بھرے ہوئے بادل کی طرح بڑھنا شروع کر دیتی ہیں اور سارے مُلک پر چھا جاتی ہیں۔ مرہٹوں کی طاقت یا نظام حیدر آباد کی طاقت کے مقابلہ میں مدراس میں انگریزوں کی دسویں حصّہ کے برابر بھی طاقت نہیں تھی۔ اِسی طرح سراج الدولہ کی طاقت کے مقابلہ میں بنگال میں انگریزوں کی طاقت دسویں حصّہ کے برابر بھی نہ تھی مگر باوجود اِس کے مقابلہ میں وہ ہار جاتے ہیں اور انگریز جیت جاتے ہیں۔ اِس تمام فتح اور شکست کی تہہ میں ایک ہی وجہ نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ بڑے بڑے وزراء اور افسر یا رشوت خور تھے یا وہ کسی اور لالچ میں آ جاتے تھے۔ اگر یہ بددیانتی نہ ہوتی تو کبھی ہندوستان پر انگریزی حکومت قائم نہ ہوسکتی لیکن اِس بددیانتی کی موجودگی میں اگر انگریزی حکومت نہ ہوتی تو فرانسیسی حکومت ہوتی۔ اگر فرانسیسی حکومت نہ ہوتی تو پُرتگیزی حکومت ہوتی، اگر پُرتگیزی حکومت نہ ہوتی تو کوئی اور حکومت ہوتی۔ بہرحال یہ مُلک اِس قابل نہ تھا کہ اپنا بوجھ آپ اُٹھا سکتا۔

بددیانتی کے بوجھ نے اِن لوگوں کی کمریں خَم کر دی تھیں اور لالچ کے مارے اِن لوگوں کو ایسا جھُکا دیا تھا کہ وہ شریف لوگوں میں سیدھا چلنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ وہ شکار تھے دُنیا کا۔ اگر انگریز نہ آتے تو کوئی اَور آتا۔ بہرحال وہ خود اپنی حکومت سنبھالنے کے ناقابل تھے۔ اوپر سے لے کر نیچے تک سب جگہ بددیانتی پائی جاتی تھی۔ پھر وسطِ ہند میں آ کر لکھنؤ اور اِس کے بعد دہلی میں جو کچھ ہوا وہ بھی اِسی بددیانتی کا کرشمہ ہے۔ غدر کی بغاوت جب ہوئی تو اُس وقت ہندوستانیوں نے چاہا کہ اپنے آپ کو انگریزوں کے تسلّط سے آزاد کر لیں اور ایسے کئی مواقع آئے جبکہ دہلی کی حکومت غالب آنے کے بالکل قریب تھی لیکن خود مُلک کے اندرونی غدّاروں اور بددیانتوں نے اِن مواقع کو ضائع کر دیا۔

یہ مشہور تاریخ واقعہ ہے کہ ایک موقع پر انگریزی فوج پر نہایت آسانی کے ساتھ گولہ باری کی جاسکتی تھی۔ مَیں نے خُود دہلی میں وہ موقع دیکھا ہے مگر زینت محل جو بادشاہ کی چہیتی ملکہ تھی اور اُسے کہا تھا کہ اگر تم ہمارا ساتھ دو گی تو تمہارے بیٹے کو تخت مل جائے گا۔ جب دہلی کے

فوجی افسروں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ قلعہ پر توپیں رکھ کر چلا دی جائیں اور بادشاہ نے بھی اِن کے مشورہ کو قبول کر لیا تو انگریزی فوج کی طرف سے زینت محل کو پیغام پہنچا کہ اگر تم نے اِس موقع پر توپیں چلنے دیں تو تمہاری تمام اُمیدیں ہوا ہو جائیں گی۔ تریا چِرتر[1] تو ہمارے مُلک میں مشہور ہی ہے۔ جب بادشاہ نے توپیں چلانے کا حکم دیا تو بیگم کو بناوٹی طور پر غش پر غش آنے لگ گئے اور اُس نے بادشاہ سے کہا کہ توپ کی آواز سے میرا دل دہل جاتا ہے۔ اگر آپ نے توپوں کا چلنا بند نہ کیا تو مَیں مر جاؤں گی۔ پس خدا کے لئے توپوں کا چلنا بند کرائیں اور اگر توپیں چلانا ضروری ہی ہیں تو اپنے ہاتھ سے پہلے مجھے قتل کر دیں تاکہ مَیں اِن کی آواز نہ سُن سکوں۔ بادشاہ بھی دھوکے میں آ گئے اور گولہ باری کا حکم منسوخ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ وہ ایک ہی مقام جہاں سے کامیابی کے ساتھ انگریزی فوجوں پر حملہ ہو سکتا تھا اُس پر سے گولہ باری بند کر دی گئی اور انگریزی فوجیں غالب آ گئیں۔ خود بادشاہ کا وزیر اعظم اندر سے انگریزوں کے ساتھ ملا ہؤا تھا اور انگریزوں کو باقاعدہ اندرونی خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔

اودھ کی حکومت بھی اِسی طرح تباہ ہوئی وہاں کے لوگوں کا تمام روپیہ کلکتہ کے انگریزی بینک میں جمع تھا۔ جب انگریزوں نے اِس علاقہ پر حملہ کیا تو اُنہوں نے لوگوں کو کہلا بھیجا کہ اگر تم نے ذرا بھی ہمارے خلاف آواز اُٹھائی یا مقابلہ کیا تو تمہارا تمام روپیہ ضبط کر لیا جائے گا۔ جب تک ان کے روپے جمع نہیں تھے اُس وقت تک تو انہیں یہ لالچ دیا گیا کہ اگر تم اپنے روپے ہمارے بنک میں جمع کرو گے تو تمہیں بہت کچھ سُود ملے گا اور جب روپیہ جمع ہو گیا اور اودھ پر اُنہوں نے حملہ کی تیاری کی تو سب کو نوٹس دے دیا کہ اگر تم نے ہمارا مقابلہ کیا تو سب روپیہ ضبط کر لیا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ جب انگریزی فوج اندر داخل ہوئی تو ایک شخص بھی اُن کے مقابلہ کے لئے کھڑا نہ ہؤا۔

اب اِس میں بھلا انگریزوں یا کسی اَور قوم کا کیا قصور ہے؟ یہ خود اپنی قوم کا قصور ہے کہ لوگ اپنے اخلاق کی اصلاح کی طرف توجّہ نہیں کرتے۔ جب کبھی ہندوستان میں کانگرس کا شور بُلند ہؤا ہے مَیں نے ہمیشہ انہیں یہی کہا ہے کہ تم اُس وقت تک حکومت نہیں کر سکتے جب تک لوگوں کے اندر بد دیانتی پائی جاتی ہے۔ ہاں اگر قومی طور پر تم دیانت کو لوگوں کے اندر قائم کر دو

تو پھر مَیں اِس بات کا ذمّہ دار ہوں کہ انگریز آپ ہی آپ تم سے صلح کرنے کے لئے آگے بڑھیں گے۔ اب بھی دیکھ لو کیا ہو رہا ہے۔ گو کئی صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہو چکی ہیں مگر انہی صوبوں میں خطرناک طور پر رشوتیں چل رہی ہیں اور اب تو گاندھی جی نے بھی اپنے اخبار میں لکھا ہے کہ بعض واقعات میرے سامنے ایسے آئے ہیں جن سے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔

تو جب تک کسی قوم میں دیانت نہیں اُس وقت تک نہ اُس قوم میں حکومت رہ سکتی ہے نہ وہ حکومت لے سکتی ہے اور اگر بالفرض وہ کبھی اپنی کثرتِ تعداد کی بناء پر حکومت لے بھی لے تو وہ حکومت کو سنبھال نہیں سکتی مگر یہ چیز صرف حکومت سے تعلق نہیں رکھتی کہ یہ کہا جائے کہ آپ حکومتوں کی بات لے بیٹھے ہیں جماعت احمدیہ کی بات کیوں نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ طاقت اور جتّھا حکومتوں سے ہی وابستہ نہیں ہوتا بلکہ قوموں سے بھی وابستہ ہوتا ہے اور بعض قومیں تو تلوار سے جیتتی ہیں اور بعض نظام اور تبلیغ سے جیتتی ہیں۔ ہماری جماعت تلوار سے جیتنے والی نہیں بلکہ نظام اور تبلیغ سے جیتنے والی ہے اور نظام اور تبلیغ سے جیتنے والی جماعتوں کو دیانت کی اُن جماعتوں سے بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ جن قوموں کے پاس تلوار ہو وہ تو بددیانتوں کا تلوار سے سر اُڑا سکتی ہیں مگر جن کے پاس تلوار نہ ہو اُنہیں بددیانتی بہت زیادہ نقصان پہنچایا کرتی ہے کیونکہ اُن کے پاس بددیانتوں کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ انگریزوں میں یا فرانسیسیوں میں یا جرمنوں میں جب کوئی شخص غدّاری کرتا ہے تو انگریز، فرانسیسی اور جرمن اِس پر مقدمہ کرتے اور مجرم ثابت ہونے پر اُسے مار ڈالتے ہیں مگر جن کے پاس حکومت نہیں ہوتی اور جو تلوار سے کامیاب نہیں ہونا چاہتے بلکہ نظام اور تبلیغ سے کامیاب ہونا چاہتے ہیں اُن میں جب کوئی غدّار پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اُس کا سوائے اِس کے اَور کیا علاج کر سکتے ہیں کہ دلائل سے اُس کا مقابلہ کریں۔ مگر اِس رنگ میں مقابلہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ غدّار شور مچاتا رہتا ہے اور اِس کو دیکھ کر بعض اور لوگ بھی جن کی فطرت میں غدّاری کا مادہ ہوتا ہے یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ ان کے پاس طاقت تو ہے نہیں چلو ہم بھی ذرا شور مچا دیں۔ چنانچہ وہ بھی جماعت کو بدنام کرنے لگ جاتے ہیں۔ اِس قسم کے مفاسد کو دور کرنے کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ

غدّاری کا قلع قمع اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک قوم میں ایسی رُوح پیدا نہ ہو کہ اس کا ہر فرد موت کو غدّاری پر ترجیح دے اور وہ کہیں کہ ہم مر جائیں گے مگر غداری نہیں کریں گے۔ یہ بددیانتی کبھی انفرادی ہوتی ہے اور کبھی قومی۔ انفرادی بددیانتی اقتصادیات کو بِالکل تباہ کر دیتی ہے۔ مَیں جب کشمیر گیا تو مجھے معلوم ہوا کشمیر کے تاجروں کی صرف چاندی کے کام کی ایک کروڑ روپیہ کی تجارت یورپ والوں سے تھی۔ اب ایک کروڑ روپیہ کی تجارت کے یہ معنی ہیں کہ بیس پچیس لاکھ روپیہ انہیں بطور منافع حاصل ہوتا تھا کام کی مزدوری الگ تھی لیکن مجھے بتایا گیا کہ اب یہ تجارت سولہ لاکھ روپیہ تک رہ گئی ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے لوگ کہتے ہیں یہاں کے مال کا کوئی معیار نہیں کبھی کوئی چیز بھیج دیتے ہیں اور کبھی کوئی۔ کبھی تو نہایت اعلیٰ مال روانہ کریں گے اور کبھی اِس میں کھوٹ ملا دیں گے۔ حالانکہ اگر وہ دیانتداری سے کام کرتے تو آج وہ ایک کروڑ کی تجارت تین چار کروڑ روپیہ تک پہنچی ہوئی ہوتی۔ پہلے زمانہ میں تو تجارتیں بہت کم تھیں۔ تجارت میں زیادتی اِسی زمانہ میں ہوئی ہے۔ پھر اگر اُس زمانہ میں جبکہ تجارت کا رواج بہت کم تھا ان کی ایک کروڑ روپیہ کی تجارت ہوسکتی تھی تو لازماً اب وہ تجارت تین چار کروڑ روپیہ کی ہو جاتی مگر بجائے اِس کے کہ ان کی تجارت تین چار کروڑ روپیہ تک ترقی کرتی اور کروڑ ڈیڑھ کروڑ روپیہ انہیں نفع حاصل ہوتا پہلی تجارت بھی گر گئی اور وہ ایک کروڑ سے اُتر کر سولہ لاکھ روپیہ تک آ گئی۔ اگر وہ تھوڑے سے نفع کی خاطر بددیانتی کر کے اپنے کام کو نقصان نہ پہنچاتے تو نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کی یہ تجارت خوب چلتی مگر چونکہ اُنہوں نے بددیانتی کی اِس لئے تجارت میں نقصان ہو گیا تو انفرادی اعتبار بھی دیانت سے ہی قائم رہتا ہے۔ انگریزوں کو ہی دیکھ لو اُن کے کئی لوگ دُشمن ہیں مگر وہ دُشمن بھی یہ اقرار کرتے ہیں کہ تجارت کے معاملہ میں انگریزوں پر زیادہ اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ وہ اتنا اعتبار جرمنوں پر نہیں کریں گے، وہ اتنا اعتبار جاپانیوں پر نہیں کریں گے جتنا اعتبار وہ انگریزوں پر کریں گے کیونکہ انگریزوں نے دیانتداری کے نتیجہ میں اعتماد پیدا کر لیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے جاپانیوں پر بھی لوگ زیادہ اعتبار نہیں کرتے اور جاپان سے تجارت کرنے والوں کے ہمیشہ دیوالے نکلتے رہتے ہیں۔ مَیں نے ایک دفعہ کلکتہ کے چند تاجروں سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے جاپانی تجارت کرنے والے دیوالے کیوں نکالتے رہتے ہیں

تو اُنہوں نے بتایا کہ جاپانی تاجر عجیب قسم کی حرکت کرتے ہیں وہ پہلے اپنی ایک چیز کی ایک رقم معیّن کر کے اطلاع دے دیتے ہیں مثلاً وہ بوٹ بناتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ اِس کی قیمت ایک روپیہ فی جوڑا ہے۔ اب اتنا سستا بوٹ دیکھ کر بڑے بڑے تاجر اُنہیں آرڈر دے دیتے ہیں۔ کوئی ایک لاکھ کا آرڈر دے دیتا ہے، کوئی دو لاکھ کا آرڈر دے دیتا ہے، کوئی تین لاکھ کا آرڈر دے دیتا ہے اور کوئی چار لاکھ کا آرڈر دے دیتا ہے۔ ابھی وہ مال پہنچتا نہیں کہ اطلاع آ جاتی ہے اب اِسی بوٹ کے بارہ آنے ہو گئے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ تاجر جنہوں نے پہلی دفعہ مال نہیں منگوایا تھا کئی لاکھ کا آرڈر دے دیتے ہیں مگر اُن کا مال بھی ابھی اُن تک نہیں پہنچتا کہ اطلاع آ جاتی ہے اِس بوٹ کی قیمت آٹھ آنے ہو گئی ہے اِس قدر سستا بوٹ دیکھ کر پھر اَور لوگ انہیں آرڈر دے دیتے ہیں۔ اب گو اِس طرح ان کا مال زیادہ بِک جاتا ہے مگر وہ پہلا تاجر جس نے پانچ لاکھ روپیہ کا مال منگوایا تھا اُس کو اڑھائی لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے اور اِس طرح آئندہ کے لئے وہ جاپانی تاجروں سے مال منگوانے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے لگتا ہے۔ گو چیزوں کے زیادہ سستا ہونے اور اُن کی زیادہ بکری ہو جانے کی وجہ سے جاپانی تاجروں کو ابھی یہ محسوس نہیں ہؤا کہ وہ ایک غلط راستہ پر چل رہے ہیں مگر انجام کار ایسی عادت مُفید ثابت نہیں ہوتی اور وہ نقصان پہنچا کر رہتی ہے۔ گو جاپانی مال میں بد دیانتی نہیں کرتے مگر چونکہ وہ قیمتوں کو بڑھاتے گھٹاتے رہتے ہیں اِس لئے گو ابھی اپنی چیزوں کو زیادہ سستا فروخت کرنے کی وجہ سے انہیں نقصان نہیں پہنچا مگر جب بھی برابر کی قیمت کا سوال آ جاتا ہے اُس وقت واقف تاجر انگریزی مال کو جاپانی مال پر ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جاپانی ٹھگی کر لیتے ہیں مگر انگریز ٹھگی نہیں کرتے۔ انگریزوں سے اُتر کر امریکہ اور جرمنی کے لوگ ہیں اور اُن سے اُتر کر اَور ممالک کے لوگ۔ مگر ہندوستانی تجارت میں اتنا خطرناک طور پر بدنام ہے کہ کوئی قوم اِس پر اعتبار نہیں کرتی۔ مکّہ مکرمہ میں سب سے زیادہ حج کے لئے جانے والے ہندوستانی ہی ہوتے ہیں مگر جانتے ہو وہاں ہندوستانی کا کیا نام ہے؟ وہاں ہندوستانی کو بطّال کہا جاتا ہے یعنی وہ سخت جھوٹا اور بد دیانت ہوتا ہے۔ جب بھی کسی ہندوستانی کا ذکر ان کے سامنے آ جائے گا وہ کہیں گے ''ہندی بطّال'' یعنی ہندوستانی سخت جھوٹا اور دھوکے باز اور چور ہوتا ہے۔ وہ جاوی پر اعتبار

کرلیں گے، وہ چینی پر اعتبار کرلیں گے، وہ افغان پر اعتبار کرلیں گے، وہ مصری پر اعتبار کرلیں گے، وہ ایرانی پر اعتبار کرلیں گے، وہ روسی پر اعتبار کرلیں گے مگر جس وقت کسی ہندوستانی کا سوال ان کے سامنے آئے گا وہ کہیں گے ہندی بطّال، ہندی بڑا جھوٹا اور چور ہوتا ہے۔

ہندوستانی ہی سب سے زیادہ مکّہ مکرمہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ ہندوستانی ہی مقامات مقدسہ کی حفاظت میں سب سے زیادہ حصّہ لیتا ہے اور ہندوستانی ہی سب کے آگے رہنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہاں کے لوگوں پر اِس نے کیا اثر ڈالا ہے یہی کہ ہندی بطّال۔ اگر اِن کے اخلاق اچھے ہوتے تو جس طرح انہوں نے باہر کے لوگوں کے لئے قُربانیاں کی تھیں اُسی طرح کوئی ان کے لئے بھی تو قربانی کرتا۔ مگر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ تُرکوں کی خلافت پر حملہ ہوتا ہے تو ہندوستانی مسلمان اس کی حفاظت کے لئے آگے بڑھتے ہیں، مصر پر انگریزوں کے دانت تیز ہوتے ہیں تو ہندوستان کے مسلمان اِس کے مقابلہ کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیتے ہیں، افغانستان پر حملہ ہوتا ہے تو ہندوستانی مسلمان مضطرب ہو جاتے ہیں، ایران خطرہ میں ہوتا ہے تو ہندوستانی مسلمان چیخ اُٹھتے ہیں۔ گویا دُنیا جہاں کا درد ہندوستان کے مسلمان کے سینہ میں ہے اور جہاں کہیں کسی مسلمان کو تکلیف پہنچتی ہے وہ اِس کے اثر سے مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے مگر جب ہندوستان کے مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو مصر کے لیڈر بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان بڑے احمق ہیں جب اُنہیں آزادی مل رہی ہے تو وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کیوں نہیں کرتے، ترک بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان بڑے احمق ہیں انہیں عقلمندی کے ساتھ کام کرنا نہیں آتا، ایرانی بھی کہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان بیوقوف ہیں اور افغانی بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان عقل و سمجھ سے عاری ہیں۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ اِن کے کیریکٹر کا بُرا اثر اِن لوگوں کے دلوں پر ہے اور اِسی کیریکٹر کے بداثر کی وجہ سے وہ ان کی قُربانی کی بھی قدر نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی قُربانی بھی اِن کی کمزوری کی حالت ہے جس طرح ایک کمزور انسان بعض دفعہ جوش میں آجاتا ہے مگر اُس کا جوش کسی نیکی کی وجہ سے نہیں بلکہ طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے اِسی طرح وہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان کے مُسلمانوں کی قُربانی بھی کسی نیکی کی وجہ سے نہیں بلکہ کمزوری کی وجہ سے ہے۔ اگر یہاں کے

آٹھ کروڑ مسلمانوں کے اندر صحیح اخلاق ہوتے تو یہ آٹھ کروڑ مسلمان بھی ہندوستان کو بچا سکتا تھا۔ بلکہ آٹھ کروڑ کیا اگر چار کروڑ با اخلاق مسلمان بھی ہندوستان میں موجود ہوتا تو کوئی غیر حکومت اِس ملک کی طرف اپنی آنکھ نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ بھلا چار کروڑ مسلمانوں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتے تھے چند ہزار انگریز یا چند ہزار فرانسیسی یا پُرتگیزی۔ پھر چار کروڑ ہی نہیں اگر دو کروڑ دیانت دار مسلمان بھی ہندوستان میں موجود ہوتے تب بھی یہ مُلک دوسروں کا غلام نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر اُس وقت مسلمانوں کی حکومت میں دو کروڑ ایسے مسلمان موجود ہوتے جو اپنی جانیں قُربان کرنے کے لئے تیار ہوتے تو کس کی طاقت تھی کہ وہ ہندوستان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکتا۔ بلکہ مَیں کہتا ہوں اگر ایک کروڑ بھی دیانتدار مسلمان ہوتا، ایک کروڑ نہیں پچاس لاکھ ہی ہوتے، پچاس لاکھ نہیں پچیس لاکھ ہی ہوتے، پچیس لاکھ نہیں بارہ لاکھ ہی دیانتدار مسلمان موجود ہوتے تو بھی آج ہمارے مُلک کی وہ حالت نہ ہوتی جو نظر آرہی ہے۔

بارہ لاکھ دیانتدار مسلمانوں کی موجودگی کے معنے یہ تھے کہ ایک لاکھ جاں نثار سپاہی میسّر آسکتا تھا اور اگر ایک لاکھ جان نثار سپاہی اُس وقت موجود ہوتا تو انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مجموعی طاقت بھی اُن کا مقابلہ نہ کرسکتی۔ کسی مُلک کی آبادی کے آٹھ فیصدی حصّہ کا سپاہی ہونا معمولی بات ہے۔ جو جنگی قومیں ہوتی ہیں اُن میں بعض دفعہ سولہ فیصدی تک سپاہی ہوتے ہیں اور جب انتہائی خطرہ کا وقت آتا ہے تو تیس بلکہ چالیس فیصدی آبادی بھی لڑائی کے لئے تیار ہوجاتی ہے۔ بہرحال کسی مُک کا جو ادنیٰ سے ادنیٰ فوجی معیار ہے اگر وہی ہمارے مُلک میں قائم ہوتا تو بارہ لاکھ مسلمانوں میں سے ایک لاکھ سپاہی ضرور مل جاتا اور اعلیٰ معیار کے رُو سے پونے پانچ لاکھ مسلمان انگریزوں کے مقابلہ کے لئے تیار ہوتے۔ اب اگر اتنی بڑی تعداد ہندوستان میں موجود ہوتی تو کونسی قوم تھی جو ہندوستان کو فتح کرسکتی۔ یقیناً نہ انگریز ہندوستان کو فتح کرسکتے نہ فرانسیسی اِسے فتح کرنے کی طاقت رکھتے اور نہ پرتگیزی اسے فتح کرنے کی طاقت رکھتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس وقت صرف چند ہزار یا چند سو ایسے لوگ تھے جو دیانتدار تھے اور جو مُلک کے لئے قُربانی کرنے کی رُوح اپنے اندر رکھتے تھے۔ باقی جس قدر تھے وہ ٹھگ تھے، وہ فریبی تھے، وہ دھوکے باز تھے، وہ رشوت خور تھے، وہ نمک حرامی کرتے تھے اور غیروں سے

رشوتیں لے لے کر اپنے مُلک کی حکومت کو آپ تباہ و برباد کرنے کے درپے ہو رہے تھے۔

کیا ہی بدقسمت وہ مُلک ہے جس میں ۳۳ کروڑ کی آبادی ہو مگر مُلک کی خاطر چار پانچ ہزار آدمی بھی اِس میں وفادار نہ ہو۔ اِس سے زیادہ بدقسمتی کی مثال اَور کیا ہوسکتی ہے؟ پھر مُلک کو جانے دو عقل کے ساتھ تو اُنہوں نے اپنے ساتھ بھی وفاداری نہیں کی۔ حکومت تو گئی ہی تھی، تجارت کیوں گئی؟ مگر اِن کے ہاتھ سے تجارت کا نکل جانا بھی بتاتا ہے کہ یہ اپنے نفس اور اپنی ذات کے بھی وفادار نہیں۔ اگر اِن میں اپنے نفس کے ساتھ وفاداری کا ہی مادہ ہوتا تو اِن کے ہاتھ سے تجارت کبھی نہ جاتی۔ تو بددیانتی ایسی چیز ہے جو قوموں اور افراد دونوں کو تباہ کر دیتی ہے مگر جس قوم میں دیانت آ جائے اُسے ہر جگہ عزّت حاصل ہوتی ہے اور کوئی اُسے ذلیل نہیں کر سکتا۔

اِسی طرح انفرادی دیانت جب کسی قوم میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اقتصادی طور پر بڑھتی چلی جاتی ہے مگر یہ انفرادی دیانت دو قسم کی ہوتی ہے ایک تجارتی دیانت اور ایک اخلاقی دیانت۔ جن قوموں میں اخلاقی دیانت نہ ہو مگر تجارتی دیانت ہو وہ بھی نہیں گرتیں۔ چنانچہ ہندوؤں کو ہی دیکھ لو بنیے ہیں اخلاقی دیانت نہیں مگر تجارتی دیانت ہے اور اِس وجہ سے وہ تجارت میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے، یہودیوں میں بھی اخلاقی دیانت نہیں لیکن تجارتی دیانت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کی تجارت روز بروز بڑھ رہی ہے اِسی طرح جس قوم میں اخلاقی دیانت پیدا ہو جائے اُس کا اخلاقی طور پر دوسروں کے قلوب پر سکّہ بیٹھ جاتا ہے اور اِس قوم کے افراد جہاں جاتے ہیں لوگ ان سے مشورہ لیتے اور ان کی باتوں پر اپنے کاموں کا انحصار رکھتے ہیں لیکن جس قوم میں قومی دیانت بھی ہو، تجارتی دیانت بھی ہو اور اخلاقی دیانت بھی ہو وہ قوم تو ایک پہاڑ ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہمالیہ پہاڑ کو اُڑایا جا سکے مگر یہ ممکن نہیں کہ اِس قوم کو برباد کیا جا سکے۔ ایسی قوم نہ صرف خود محفوظ ہوتی ہے بلکہ اور لوگوں کی حفاظت کا بھی موجب ہوتی ہے اور اِس کے ذریعہ اور قومیں حوادث اور مصائب سے بچائی جاتی ہیں اور وہ دُنیا کے لئے ایک تعویذ ہو جاتی ہے۔

پس میں خدام الاحمدیہ سے کہتا ہوں کہ یہ تینوں قسم کی دیانتیں تم لوگوں کے اندر پیدا کرو۔ جس کا ذریعہ تمہارے پاس موجود ہے کیونکہ نوجوانوں کی باگ تمہارے ہاتھ میں دی گئی ہے۔

تم نوجوانوں میں قومی دیانت بھی پیدا کرو، تم نوجوانوں میں تجارتی دیانت بھی پیدا کرو اور تم نوجوانوں میں اخلاقی دیانت بھی پیدا کرو۔ تجارتی دیانت کے معنے صرف تجارت اور لین دین کے معاملات میں ہی دیانت دارانہ رویّہ اختیار کرنے کے نہیں بلکہ نوکری بھی اِسی میں شامل ہے کیونکہ نوکر اپنا وقت دوسرے کو دیتا ہے۔

پس جس طرح ہر تاجر کا فرض ہے کہ وہ تجارت میں دیانتداری سے کام لے اُسی طرح ہر ملازم کا بھی فرض ہے کہ وہ دیانتداری کے ساتھ کام کرے۔ دیانتدار نوکر کی ہر کوئی قدر کرتا اور اُسے بُلا بُلا کر رکھتا ہے لیکن اگر کسی کے متعلق ثابت ہو جائے کہ وہ دیانتداری کے ساتھ کام نہیں کرتا تو اُس کی قدر دلوں سے اُٹھ جاتی ہے۔

پس قومی دیانت، تجارتی دیانت اور اخلاقی دیانت اپنے اندر پیدا کرو۔ اخلاقی دیانت کے معنے یہ ہیں کہ باوجود اِس کے کہ اپنے قول کی پَچ کرنے پر تم کو نقصان پہنچتا ہو۔ اپنے قول کی پَچ کرتے ہوئے نقصان اُٹھا کر بھی اپنے قول کو پورا کرو اور اُسے ضائع نہ ہونے دو۔

ایک قصّہ مشہور ہے جو گو ہماری ہی قوم کا ہے مگر افسوس ہے کہ ہماری روائتیں بھی ہمارے ذریعہ محفوظ نہیں بلکہ انگریزوں کے ذریعہ محفوظ ہیں۔ جب ہم مدرسہ میں پڑھا کرتے تھے اُس وقت ریڈروں میں ایک یوسف ہسپانوی کا قصّہ آتا تھا جو اخلاقی دیانت کی بہترین مثال ہے۔ یوسف سپین کا ایک مشہور تاجر اور رئیس تھا۔ ایک دفعہ کسی شخص نے اُس کے اکلوتے لڑکے کو قتل کر دیا۔ یوسف کو اُس کا علم نہیں تھا کہ اُس کا لڑکا مارا گیا ہے۔ پولیس اُس قاتل کے پیچھے بھاگی اور وہ قاتل آگے آگے بھاگا۔ دوڑتے دوڑتے وہ شخص اُسی مکان کے اندر آ گیا جہاں یوسف رہتا تھا اور اُس سے کہنے لگا کہ مجھے پناہ دو پولیس میرے تعاقب میں آ رہی ہے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ مَیں نے اِسی شخص کے بیٹے کو قتل کیا ہے اور یوسف کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ میرے بیٹے کا قاتل ہے۔ عربوں کا یہ ایک خاص قومی کیریکٹر ہے کہ جب اُن کے گھر میں کوئی شخص آ کر اُن سے پناہ کا طلب گار ہو تو وہ انکار نہیں کر سکتے اور اُسے ضرور پناہ دے دیتے ہیں۔ یوسف نے بھی کہا کہ بہت اچھا تم میری پناہ میں ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس والے آئے اور اُنہوں نے پوچھا کہ یہاں کوئی شخص دوڑتے دوڑتے آیا ہے؟ وہ ایک شخص کا قاتل ہے اور ہم اُسے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔

یوسف نے کہا یہاں تو کوئی نہیں۔ دراصل یوسف نے اُسے اِدھر اُدھر کہیں کھسکا دیا تھا۔ اِس طرح اُس نے اپنی بات بھی سچی کر لی اور واقعہ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ چنانچہ پولیس واپس چلی گئی تھوڑی دیر گزری تھی کہ نوکر اس کے لڑکے کی لاش اُٹھا کر پہنچ گئے اور اُنہوں نے کہا کہ اِسے ابھی کسی شخص نے قتل کر دیا ہے۔ وہ اپنے لڑکے کی لاش دیکھتے ہی ساری حقیقت سمجھ گیا اور بھانپ گیا کہ جس شخص کو مَیں نے پناہ دی ہے وہی میرے لڑکے کا قاتل ہے مگر اُس کے اندر کوئی لغزش پیدا نہ ہوئی اور اُس نے پھر بھی پولیس کو یہ نہ بتایا کہ جس شخص نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے اُسے میں نے فلاں جگہ چھپا رکھا ہے۔ جب لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے تو وہ اُس شخص کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ جس شخص کو تم نے مارا ہے وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے مگر چونکہ مَیں تمہیں پناہ دینے کا وعدہ کر چُکا ہوں اِس لئے مَیں تجھے کچھ نہیں کہتا بلکہ مَیں خود تجھے بھاگنے کا سامان دیتا ہوں۔ یہ میری اونٹنی لے اور یہ سامان اِس پر لاد اور یہاں سے کسی دُوسری طرف کو نکل جا۔ چنانچہ وہ اونٹنی پر سوار ہؤا اور بھاگ کر کسی اور علاقہ کی طرف نکل گیا یہ اخلاقی دیانت ہے۔ اس میں اِس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان تھا مگر چونکہ وہ قول دے چُکا تھا اور اس میں کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی بھی نہیں تھی اِس لئے اس نے اپنا قول نہ چھوڑا اور گو دوسرے شخص نے اس کے اکلوتے بیٹے کو مار دیا تھا مگر پھر بھی اِس کی جان کو بچا دیا۔

تو فردی دیانت بھی نہایت اہم ہوتی اور دلوں کو ہلا دیتی ہے۔ اِسی طرح ابتدائے اسلام کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص قتل کے جرم میں پکڑا گیا۔ اُس نے کہا کہ مجھے کچھ مُہلت دیجئے کیونکہ میرے پاس بعض یتامیٰ کی امانتیں ہیں اور مَیں چاہتا ہوں کہ گھر جا کر وہ امانتیں انہیں واپس کر دوں۔ وہ ایک بدوی تھا اور بدویوں کا پکڑنا نہایت مُشکل ہوتا ہے کیونکہ سینکڑوں میل کا صحرا ہوتا ہے جس میں وہ رہتے ہیں اور آج اگر یہاں ہوتے ہیں تو کل وہاں، کوئی ایک مقام اُن کا ہوتا نہیں کہ وہاں سے انہیں تلاش کیا جا سکے اور اگر ہاتھ سے نکل جائیں تو پھر اُن کا ڈھونڈنا بہت مُشکل ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم کوئی ضمانت دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ بغیر ضمانت کے ہم تمہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ اِس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ایک صحابی کی طرف جو ابوذرؓ یا ابوالدرداءؓ تھے، مجھے اِس وقت صحیح نام یاد نہیں،

اشارہ کر کے کہا یہ میرے ضامن ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ ضمانت دیتے ہیں؟ اُنہوں نے کہا ہاں مَیں اِس کی ضمانت دیتا ہوں۔ اب ایک قاتل کی ضمانت دینے کے معنے یہ تھے کہ اگر وہ مقررہ وقت پر نہ پہنچے تو مجھے مار ڈالنا۔ اُن کی ضمانت پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُسے چھوڑ دیا اور وہ چلا گیا۔ جب وہ دن آیا جو اُس کی سزا کے لئے مقرر تھا تو لوگ اُس بدوی کا انتظار کرنے لگے کہ کب آتا ہے مگر وقت گزرتا جائے اور اُس کی آمد کا کوئی پتہ نہ لگے۔ آخر اِس صحابی کے دوستوں کے دلوں میں تشویش پیدا ہوئی اور اُنہوں نے اُس سے پوچھا کہ آپ جانتے بھی ہیں وہ ہے کون؟ اُنہوں نے کہا مجھے تو معلوم نہیں وہ کون تھا۔ وہ کہنے لگے تو پھر آپ نے ضمانت کیوں دی؟ اُنہوں نے کہا اُس نے جو مجھ پر اعتبار کیا تھا تو مَیں اُس پر کیوں اعتبار نہ کرتا۔ خیر اُن کے دوستوں کے دلوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوگئی کہ نہ معلوم اب کیا ہوگا۔ مگر جب عین وہ وقت پہنچا جو اُس کی سزا کے لئے مقرر تھا تو لوگوں نے دیکھا کہ دُور سے ایک غبار اُڑتا چلا آرہا ہے سب لوگوں کی آنکھیں اُس طرف لگ گئیں۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اُنہوں نے دیکھا ایک سوار نہایت تیزی سے گھوڑا دوڑاتا چلا آرہا ہے۔ یہاں تک کہ گھوڑے کا پیٹ زمین سے لگ رہا ہے۔ جب وہ قریب پہنچا تو اُدھر وہ گھوڑے سے اُترا اور اِدھر اِس گھوڑے نے دم دے دیا اور مر گیا۔ یہ سوار وہی شخص تھا جس کی اِس صحابی نے ضمانت دی تھی۔ وہ کہنے لگا میرے پاس امانتیں کچھ زیادہ تھیں اُن کو واپس کرنے میں مجھے دیر ہو گئی اور مَیں اپنے گھوڑے کو مارتا اور اُسے نہایت تیزی سے دوڑاتا ہوا یہاں پہنچا تا کہ میرے ضامن کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔[2]

تو دیانت ایسی چیز ہے کہ باوجود اس کے ان واقعات پر سینکڑوں سال گزر گئے آج بھی ہم اِن واقعات کو پڑھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اِس گناہ سے بھری ہوئی دُنیا میں نہیں بلکہ ایک ایسی جنت میں ہیں جو خوبیاں ہی خوبیاں اپنے اندر رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ انفرادی واقعات ہیں کروڑوں اور اربوں میں سے کسی ایک انسان کا واقعہ ہے مگر یہ ایک واقعہ بھی انسانیت کو اتنا خوبصورت کر کے دکھا دیتا ہے کہ دُنیا کے سارے گناہ نگاہوں سے پوشیدہ ہوجاتے ہیں۔ اِسی طرح تجارتی دیانت کی بھی ہمارے آباء میں مثالیں پائی جاتی ہیں چنانچہ

تاریخوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص گھوڑے کو فروخت کرنے کے لئے بازار میں لایا اور اُس نے کہا کہ اِس کی پانچ سو درہم قیمت ہے۔ ایک صحابی نے اُس گھوڑے کو دیکھا اور اُسے پسند کیا اور کہا کہ مَیں یہ گھوڑا لیتا ہوں مگر اِس کی قیمت میں پانچ سَو نہیں بلکہ دو ہزار درہم دوں گا کیونکہ یہ گھوڑا نہایت اعلیٰ قسم کا ہے اور اِس کی قیمت اتنی تھوڑی نہیں جتنی تم بتاتے ہو۔ اِس پر گھوڑا بیچنے والا اصرار کرنے لگا کہ مَیں پانچ سَو درہم لوں گا اور گھوڑا خریدنے والا اصرار کرنے لگا کہ مَیں دو ہزار درہم دوں گا۔ ایک کہتا کہ اے شخص تجھے گھوڑے کی پہچان نہیں یہ گھوڑا زیادہ قیمت کا ہے اور دوسرا کہتا کہ مَیں صدقہ لینا نہیں چاہتا۔ مَیں اپنے گھوڑے کو جانتا ہوں اِس کی قیمت پانچ سَو درہم ہی ہے۔[۳] اِس کے کتنا اُلٹ نظارہ آج دُنیا میں نظر آتا ہے۔ وہاں تو یہ تھا کہ چیز خریدنے والا قیمت بڑھاتا تھا اور چیز بیچنے والا قیمت گراتا تھا اور یہاں یہ حال ہے کہ دو دو آنے کی چیز بعض دفعہ دس دس روپے میں فروخت کی جاتی ہے۔ بمبئی میں مَیں نے اِن دو سفروں میں جو حال ہی میں مَیں نے کئے ہیں نہیں دیکھا لیکن آج سے ۱۵، ۲۰ سال پہلے میں نے جو سفر کئے تھے اُن میں دو دفعہ خود میرے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ ہؤا۔ بمبئی میں چونکہ عام طور پر نَو وارد لوگ آتے رہتے ہیں اور وہ قلموں کی شناخت کا مادہ اپنے اندر نہیں رکھتے اس لئے بعض لوگوں نے وہاں یہ طریق اختیار کیا ہؤا ہے کہ جب کسی اجنبی شخص کو دیکھیں گے اُسے آ ملیں گے اور کہیں گے کہ مَیں مسافر ہوں فلاں جگہ جانا چاہتا ہوں مگر کرایہ کم ہو گیا ہے، میرے پاس یہ قلم ہے اِس کی پندرہ روپے قیمت ہے مگر آپ دس روپے ہی دے دیں تو میرا کرایہ بن جائے گا۔ اب وہ قلم چھ سات پیسے کا ہوتا ہے مگر بعض دفعہ کوئی ایسا اناڑی بھی انہیں مل جاتا ہے جو اِس ملمّع کو دیکھ کر جو ٹین کے خول پر چڑھا ہؤا ہوتا ہے سمجھتا ہے کہ یہ سَودا بڑا سستا ہے اور وہ دس روپے پر اِس سے قلم لے لیتا ہے حالانکہ وہ پانچ سات پیسے کا قلم ہوتا ہے۔ پھر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو جھگڑا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قیمت زیادہ ہے ذرا کم کرو۔ اِس طرح وہ دس روپے سے نو روپے پر آتا ہے، پھر نو سے آٹھ پر، آٹھ سے سات پر، سات سے چھ پر، چھ سے پانچ پر، پانچ سے چار پر حتّٰی کہ بعض دفعہ وہی قلم جس کی قیمت وہ پہلے پندرہ روپے بتلاتے ہیں چھ سات آنے پر دے دیتے ہیں اور لینے والا سمجھتا ہے کہ مَیں نے خوب لُوٹا۔ حالانکہ پھر بھی وہی شخص انہیں

لُوٹ کر لے گیا ہوتا ہے کیونکہ وہ قلم چند پیسوں کا ہوتا ہے اور وہ کئی آنے بٹور لیتا ہے۔ خود میرے ساتھ بھی ایک دفعہ ایسا ہی ہؤا مگر مجھے چونکہ بعض دوستوں نے یہ بات بتا دی تھی اِس لئے مَیں نے فوراً کہہ دیا کہ مجھے ضرورت نہیں۔ مگر وہ کہنے لگا دس نہ سہی نو ہی دے دیں، نو نہ سہی آٹھ ہی دے دیں، آٹھ نہ سہی سات ہی دے دیں، سات نہ سہی چھ ہی دے دیں، اچھا پانچ روپے ہی دے دیں۔ جب مَیں نے کہا مَیں کہہ چُکا ہوں کہ مجھے اِس کی ضرورت نہیں تو کہنے لگا اچھا چار ہی دے دیجئے، تین ہی دے دیجئے، دو ہی دے دیجئے، چلئے ایک روپیہ ہی دے دیں۔ پھر وہ اُس سے بھی نیچے اُترا اور کہنے لگا آٹھ آنے ہی دے دیں، سات آنے ہی دے دیں، چلو چھ آنے ہی دے دیں۔ مگر مَیں نے کہا جب مَیں نے کہہ دیا ہے کہ مَیں نے نہیں لینا تو مَیں چھ آنے بھی کیوں دوں؟ اِسی طرح کشمیر میں مَیں نے دیکھا ہے وہاں لوگ مُشک کا نافہ لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِس کے اندر ایک تولہ مُشک ہے اور اِس کی اصل قیمت بتّیس روپے ہے مگر چونکہ ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہے اِس لئے ہم آپ کو چوبیس پچیس روپے میں نافہ دے سکتے ہیں۔ پھر وہی نافہ جس کی وہ پچیس روپے قیمت بتاتے ہیں بعض دفعہ آٹھ آنہ میں بھی دے دیتے ہیں اور جب تم آٹھ آنہ میں مُشک کا نافہ لے کر یہ سمجھتے ہو کہ دُنیا کے سب سے بڑے ماہر تاجر تم ہو کیونکہ تم نے ایک شخص سے مُشک کا نافہ آٹھ آنے میں لے لیا تو اس وقت بھی تم دھوکا خوردہ ہوتے ہو کیونکہ جب اسے کھول کر دیکھا جاتا ہے تو اِس میں سے کبوتر کے جمے ہوئے خون کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا اور تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ بڑے ماہر تم نہیں بلکہ بڑا ٹھگ وہی تھا جو تمہیں لُوٹ کر لے گیا۔ وہ نافہ کے باہر تھوڑی سی مُشک مل دیتے ہیں اور اندر کبوتر کا خون بھر دیتے ہیں۔ کبوتر کے خون کی بعض دوائیوں سے بالکل مُشک کی سی شکل ہو جاتی ہے اور ناواقف آدمی سمجھتا ہے کہ آج مَیں نے بڑا سستا سودا کیا۔ مَیں نے آٹھ آنہ میں مُشک کا نافہ خرید لیا۔ حالانکہ اس میں صرف کبوتر کا خون ہوتا ہے اور کبوتر کے خون کی قیمت تو ایک پیسہ بھی نہیں ہوتی۔

پھر قومی دیانت کو لے لو۔ یا تو یہ حال ہے کہ کم سے کم آٹھ کروڑ مسلمان ہندوستان میں موجود ہیں اور چند سَو انگریز اِس مُلک پر قبضہ کر لیتے ہیں اور یا یہ حال نظر آتا ہے کہ بدر کے میدان میں عرب کا ایک ہزار نہایت تجربہ کار سپاہی مکّہ کی طرف سے لڑنے آتا ہے اُن کے

مقابلہ میں صرف ۳۱۳ آدمی ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جنہوں نے کبھی تلوار چلائی ہی نہیں اور دو تو ان میں پندرہ پندرہ سال کے لڑکے ہیں اور سپاہی کہلانے کے مستحق صرف دوسَو کے قریب آدمی ہیں اور یہ بھی کوئی بڑے پائے کے سپاہی نہ تھے سوائے چند کے مثلاً حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ۔ یہ ایسے خاندانوں میں سے تھے جن میں بچپن سے ہی فنونِ جنگ سکھائے جاتے تھے اور یہی چند آدمی تھے جو خاص طور پر ماہرِ فن سمجھے جاتے تھے باقی سب معمولی سپاہی تھے۔ مگر مکّہ کی طرف سے آنے والے لشکر میں ایک ایک آدمی ایسا تھا جو ہزار ہزار پر بھاری سمجھا جاتا تھا اور وہ تمام کے تمام فنونِ جنگ میں نہایت ماہر تھے۔ جب مسلمانوں اور کفار کا لشکر آمنے سامنے ہوا تو اُس وقت کسی نے سوال پیدا کر دیا کہ اِس لڑائی کا فائدہ کیا ہے؟ وہ تھوڑے سے آدمی ہیں اور ہیں بھی قریباً سب مکّہ کے۔ انصاری اِس جنگ میں بہت ہی کم ہیں۔ پس یہ سب ہمارے بھائی بند ہیں اگر ہم مارے گئے تب بھی اور اگر یہ مارے گئے تب بھی دونوں صورتوں میں مکّہ میں ماتم ہو جائے گا۔ اِس کی بات کو تو لوگوں نے نہ سُنا مگر اُنہوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو یہ پتہ لگانے کے لئے بھیجا کہ مسلمان کتنے ہیں اور ان کے ساز و سامان کا کیا حال ہے؟ معلوم ہوتا ہے وہ آدمی نہایت ہی ہوشیار تھا۔ جب وہ آیا تو اُس نے پہلے تو وہ جگہ دیکھی جہاں مسلمانوں کا کھانا تیار ہو رہا تھا۔ پھر اُس نے سواریوں کا اندازہ لگایا اور واپس جا کر کہا کہ میرا اندازہ یہ ہے کہ مسلمان تین سَو، سَوا تین سَو کے قریب ہیں۔ یہ کیسا صحیح اندازہ تھا جو اُس نے لگایا۔ مسلمان واقعہ میں ۳۱۳ ہی تھے مگر اُس نے کہا اے میرے بھائیو! میرا مشورہ یہ ہے کہ تم لڑائی کا خیال چھوڑ دو۔ ابوجہل یہ سُن کر جوش میں آ گیا اور اُس نے کہا کیوں ڈر گئے؟ وہ کہنے لگا مَیں ڈر گیا ہوں یا نہیں اِس کا پتہ تو میدانِ جنگ میں لگ جائے گا مگر مَیں یہ مشورہ تمہیں اِس لئے دے رہا ہوں کہ مَیں نے اونٹوں اور گھوڑوں پر آدمیوں کو چڑھے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ مَیں نے موتیں دیکھی ہیں جو اُن اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار تھیں۔ اِن میں سے ہر شخص اِس نیّت اور اِس ارادے کے ساتھ آیا ہوا ہے کہ مَیں مِٹ جاؤں گا مگر ناکام و نامراد واپس نہیں جاؤں گا۔ اِن میں سے ہر شخص کا چہرہ بتا رہا ہے کہ وہ سب کے سب یا تو خود فنا ہو جائیں گے یا تم کو فنا کر دیں گے۔ پس یہ مت خیال کرو کہ یہ لڑائی ویسی ہی

ہوگی جیسے عام لڑائیاں ہوتی ہیں بلکہ ایک نہایت ہی اہم اور فیصلہ کُن جنگ ہوگی اور یا تو وہ تمہیں فنا کر دیں گے اور اگر وہ تمہیں فنا نہ کر سکے تو وہ خود سب کے سب ڈھیر ہو جائیں گے مگر میدانِ جنگ سے اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے اور ایسی قوم کو دبانا ہی مُشکل ہوتا ہے جس کا ہر فرد مرنے کے لئے تیار ہو۔[۴]

یہ کیسا شاندار فقرہ ہے جو اُس کی زبان سے نِکلا کہ مسلمانوں میں سے ہر شخص اپنے گھر سے اِسی نیت اور اِسی ارادہ کے ساتھ نِکلا ہے کہ مَیں فتح یا موت میں سے ایک چیز کو حاصل کئے بغیر واپس نہیں لوٹوں گا۔ کیا مختصر سے فقرہ میں اُس نے اِن تمام قلبی جذبات کا اظہار کر دیا ہے جو مسلمانوں کے قلوب میں موجزن ہو رہے تھے۔ یہ فقرہ اِن تاریخی فقرات میں سے ہے جو ہمیشہ یاد رکھے جانے کے قابل ہیں کہ اے میرے بھائیو! مَیں نے آدمی نہیں دیکھے بلکہ موتیں دیکھی ہیں جو اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار تھیں۔

پھر دیکھ لو وہی ہوا جو اُس نے کہا تھا۔ وہ واقع میں موتیں بن کر ظاہر ہوئے یا تو وہ مَر گئے یا اُنہوں نے کفار کو مار دیا جن کے لئے موت مقدر تھی وہ تو مر گئے اور جن کے لئے موت مقدر نہیں تھی اُنہوں نے مکّہ والوں کا ایسا تہس نہس کیا کہ مکّہ کے ہر گلی کوچہ میں ماتم برپا ہو گیا۔

ہزار آدمی کا ایک ایسے شہر میں سے نکل کر لڑائی کے لئے تیار ہو جانا جس میں دس پندرہ ہزار آدمی رہتے ہوں معمولی بات نہیں۔ ہر بارہ آدمی کے پیچھے ایک آدمی کا مارا جانا یا زخمی ہونا کوئی کم صدمے والی بات نہیں ہوتی لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ جو آدمی مارے گئے وہ چوٹی کے آدمی تھے تو ہم اور بھی زیادہ آسانی کے ساتھ اِس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مکّہ والوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ اِن مارے جانے والے لیڈروں میں سے ایک ایک آدمی ایسا تھا جس پر ہزاروں کا گزارہ تھا۔ ابوجہل عتبہ اور شیبہ یہ سب مکّہ کے لیڈر تھے۔ بیسیوں ان کے نوکر تھے، بیسیوں ان کے غلام تھے، بیسیوں ان کی تجارت پر کام کرتے تھے اور بیسیوں کی حفاظت کے یہ ذمّہ دار تھے۔ پس ان میں سے ایک ایک آدمی تہائی یا چوتھائی شہر کا ذمّہ دار تھا اور اِس ایک آدمی کا مرنا صرف اِس کے رشتہ داروں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہزاروں اَور لوگوں کے لئے بھی ماتم کا موجب تھا۔ اِس جنگ میں شکست کھانے کے بعد مکّہ والوں کی ایسی دردناک کیفیت ہوگئی

کہ اُنہوں نے سمجھا اگر آج ماتم کیا گیا تو مکّہ کی تمام عزت خاک میں مل جائے گی۔ پس عرب کے ان لیڈروں نے جو زندہ تھے آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کر دیا کہ کوئی شخص بدر کے مقتولین کا ماتم نہ کرے اور اگر کوئی شخص ماتم کرے تو اُسے قوم سے نکال دیا جائے، اُس کا بائیکاٹ کیا جائے اور اُس پر جرمانہ کیا جائے۔ عرب ایک قبائلی قوم ہے اور جو قبائلی قومیں ہیں اُن میں قومی روح انتہاء درجہ کی شدید ہوتی ہے۔ پس اِس حکم کی خلاف ورزی اِن کے لئے ناممکن تھی۔ مائیں اپنے کلیجوں پر سِل رکھ کر، باپ اپنے دلوں کو مسُوس کر اور بچے اپنی زبانوں کو دانتوں تلے دبا کر بیٹھ گئے اور اُن کے لبوں سے آہ بھی نہیں نکلتی تھی کیونکہ ان کی قوم کا یہ فیصلہ تھا کہ آج رونا نہیں تا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُس کے ساتھی خوش نہ ہوں اور وہ یہ نہ کہیں کہ دیکھا ہم نے مکّہ والوں کو کیسی شکست دی۔ مگر دل تو جل رہے تھے، سینوں میں سے تو شعلے نکل رہے تھے، جگر تو ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ وہ دروازے بند کر کے تاریک گوشوں میں بیٹھتے اور دبی ہوئی آواز کے ساتھ روتے تا کسی کو یہ پتہ نہ لگے کہ وہ رو رہا ہے مگر یہ رونا ان کی تسلی کا موجب نہیں تھا کیونکہ انسان غم کے وقت دوسرے سے تسلی چاہتا ہے۔ بیوی چاہتی ہے کہ خاوند مجھ سے دُکھ درد کرے اور خاوند چاہتا ہے کہ بیوی مجھ سے دُکھ درد کرے، باپ چاہتا ہے کہ بیٹا میرے غم میں حصّہ لے اور بیٹا چاہتا ہے کہ باپ میرے غم میں حصّہ لے۔ اِسی طرح ہمسایہ چاہتا ہے کہ ہمسایہ والے میرا غم بٹائیں اور اگر کوئی ایسا ماتم ہو جائے جس کا اثر سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں پر ہو تو اس وقت سب لوگ چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں اور اس طرح اپنے دُکھ درد کو کم کریں۔ پس تنہائی کے گوشوں میں ان کا بیٹھ کر رونا ان کی تسلّی کا موجب نہیں تھا۔ مہینہ گزر گیا اور برابر یہ حکم نافذ رہا۔ اِس عرصہ میں وہ آگ جو اُنہوں نے اپنے سینہ میں دبا رکھی تھی سُلگتی رہی آخر مہینہ کے بعد ایک دن ایک مسافر وہاں سے گزرا اُس کی ایک اونٹنی تھی جو راہ میں ہی مرگئی۔ وہ اُس اونٹنی کے غم میں چیخیں مار کر روتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا ہائے میری اونٹنی مرگئی، ہائے میری اونٹنی مرگئی۔ تب مکّہ کا ایک بوڑھا شخص جو اپنے مکان کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھا ہوا تھا اُس نے اپنے مکان کے دروازے کھول دیئے اور بازار میں آ کر زور زور سے اُس نے پیٹنا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ اِس شخص کو اپنی اونٹنی پر رونے کی تو اجازت ہے مگر

میرے تین جوان بیٹے مارے گئے اور مجھے رونے کی اجازت نہیں دی جاتی یہ ایک نعرہ تھا جو اُس نے لگایا جس نے مکّہ میں ایک شعلہ کا کام دیا۔ اِس کے بعد نہ کسی کو قانون کا خیال رہا، نہ قوم اور برادری سے اخراج کی دھمکی کا خیال رہا، معاً مکّہ کے گھروں کے تمام دروازے کھل گئے اور چوکوں اور بازاروں میں عورتیں اور بچے پیٹنے لگ گئے۔[۵] یہ وہ موتیں تھیں جو ۳۱۳ جانباز صحابہ کی شکلوں میں ظاہر ہوئیں۔ جب ایک مَلَکُ الموت ساری دُنیا کی جان نکال لیتا ہے تو اگر انسان بھی مَلَکُ الموت کا نمائندہ بن جائے اور کہے کہ مَیں مر جاؤں گا مگر اپنے کام سے نہیں ہٹوں گا تو اُسے کون مار سکتا ہے۔ اسلام ظلم کی اجازت نہیں دیتا، اسلام قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دیتا مگر اسلام اِس معاملہ میں کوئی اِستثنیٰ نہیں کرتا کہ اگر کوئی مسلمان ڈر کر یا غدّاری سے کام لے کر میدانِ جنگ سے بھاگ آئے تو سوائے جہنم کے اُس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھنے والا ہوگا، وہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کہنے والا ہوگا، وہ نمازیں پڑھنے والا ہوگا اور زکوٰۃ دینے والا ہوگا، وہ سارے ہی احکامِ اسلام کی پابندی کرنے والا ہوگا مگر خدا اُسے فرمائے گا کہ تمہارا ٹھکانا دوزخ کے سوا اَور کہیں نہیں کیونکہ تم قومی غدّاری کے مجرم ہو۔ تو قومی غدّاری ایک نہایت ہی خطرناک جُرم ہے۔ صحابہؓ کو ہی دیکھلو اُنہوں نے قومی دیانت کا کیسا شاندار نمونہ دکھایا۔ ایسا اعلیٰ نمونہ کہ شدید ترین دُشمن بھی ان کی اِس خوبی کا اعتراف کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا پر غالب آئے اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم اپنے اندر پیدا کر کے دُنیا پر غلبہ حاصل کر سکتے ہیں۔ یقیناً یاد رکھو جو قوم مرنے مارنے پر تُلی ہوئی ہو اُسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اگر اِس پر کوئی حملہ بھی کرے تو مٹتی نہیں بلکہ اُبھرتی ہے اور گرتی نہیں بلکہ ترقی کرتی ہے۔

تو تمہارا ایک کام یہ ہے کہ تم نوجوانوں میں قومی دیانت پیدا کرو۔ اِسی طرح ان میں تجارتی دیانت پیدا کرو یا زیادہ وسیع لفظ اگر استعمال کیا جائے تو اِس کے لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم معاملاتی دیانت پیدا کرو اور اخلاقی دیانت کے پیدا کرنے سے بھی غافل نہ ہو۔

اگر تم بار بار نوجوانوں کو یہ سبق دو، اگر تم دیکھتے رہو کہ تم میں سے کسی میں دیانت کا فقدان تو نہیں ہو رہا اور اگر تم اپنے دوستوں، اپنے ہمسایوں، اپنے رشتہ داروں، اپنے اہلِ محلّہ اور

اہلِ شہر میں یہ روح پیدا کرنے کی کوشش کرو تو یقیناً تم ایک ایسا کام کرتے ہو جو احمدیت کو زندگی بخشنے والا ہے۔

باقی رہا سچ، سو سچ بھی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے بغیر دُنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔ سارے فساد اور لڑائی جھگڑے محض جھوٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔ لوگوں کو اگر ایک دوسرے پر اعتبار نہیں آتا یا تعلّقات میں کشیدگی ہوتی ہے تو محض اِس لئے کہ وہ سچ نہیں بولتے مگر جس کی سچائی پر لوگوں کو یقین ہو اُس کے متعلق وہ ایسی باتیں بھی ماننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جن باتوں کو وہ کسی دوسری صورت میں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، وہ معلوم ہوتا ہے کوئی موٹی عقل کا آدمی تھا جس نے اسلام پر غور کیا مگر اسلام کی صداقت اُس پر کسی طرح منکشف نہ ہوئی مگر پھر اُس کے دل میں شُبہ بھی پیدا ہو جاتا کہ اگر اسلام سچا ہی ہوا تو مَیں خدا تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چونکہ صدوق مشہور تھے اور ہر شخص اِس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ آپ کبھی جھوٹ نہیں بولتے اِس لئے اُس نے فیصلہ کیا کہ اِس امر کا بھی آپ سے ہی فیصلہ کرائے اور اُسی شخص سے جو مدعی ہے دریافت کرے کہ کیا وہ اپنے دعوے میں سچا ہے یا نہیں؟ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جو شخص مُدعی ہے اُسی سے وہ پوچھنے آتا ہے کہ کیا آپ واقع میں مُدعی ہیں یا یونہی کہہ رہے ہیں؟ وہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قائل نہیں تھا اِس لئے اُس نے آتے ہی کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مَیں تجھ سے ایک سوال کرتا ہوں تُو خدا کی قسم کھا کر مجھے اُس کا جواب دے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا جو بات تم دریافت کرنا چاہتے ہو دریافت کرو۔ اُس نے کہا آپ خدا کی قسم کھا کر بتائیں کہ کیا آپ نے جو دعویٰ کیا ہے یہ خدا کے حکم کے مطابق کیا ہے اور کیا واقع میں خدا نے آپ کو رسول بنایا ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَیں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے خدا نے ہی رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اُس نے کہا اگر یہ بات ہے تو ہاتھ لائیے مَیں ابھی آپ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔[۶] اب مُدعی وہی ہے اُس کے سچ اور جھوٹ پر بحث ہے مگر چونکہ دُنیوی زندگی میں وہ آپ کی سچائی کا قائل تھا اِس لئے اُس نے اپنی آخرت بھی آپ کے

سپرد کر دی اور فیصلہ کر لیا کہ جب یہ دنیوی معاملات میں جھوٹ نہیں بولتا تو یہ ممکن ہی نہیں کہ دینی معاملات میں جھوٹ بولے۔

تو سچائی ایک ایسی چیز ہے کہ وہ انسان کے رُعب کو قائم کر دیتی ہے۔ تم اگر سچ بولو اور نوجوانوں کو سچ بولنے کی ہمیشہ تلقین کرتے رہو تو تمہارا ایک ایک فرد ہزاروں کے برابر سمجھا جائے گا۔ لوگ تبلیغ کرتے اور بعض دفعہ شکایت کرتے ہیں کہ اِس تبلیغ کا اثر نہیں ہوتا لیکن اگر سچائی کامل طور پر ہماری جماعت میں پھیل جائے اور لوگ بھی یہ محسوس کرنے لگ جائیں کہ اِس جماعت کا کوئی فرد جھوٹ نہیں بولتا تو چاہے آج کے لوگ نہ مانیں مگر ان کی اولادیں اِس بات پر مجبور ہوں گی کہ احمدیت کی صداقت کو تسلیم کریں کیونکہ جب ان کی اولادیں سُنیں گی کہ فلاں شخص تھا تو بڑا سچا مگر ہمیشہ جھوٹ کی طرف لوگوں کو بُلاتا رہا تو وہ حیران ہوں گی اور یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں گی کہ جنہوں نے اِن لوگوں کو غلط عقائد میں مُبتلا سمجھا اُنہوں نے غلطی کی۔

تو نوجوانوں کو سچ بولنے کی عادت ڈالو اور خدّامِ احمدیہ کے ہر ممبر سے یہ اقرار لو کہ وہ سچ بولے گا اگر وہ کسی وقت سچ نہ بولے تو تم خود اِسے سزا دو۔ مَیں نے بارہا جماعت کو توجّہ دلائی ہے کہ یہ طوعی نظام ہے اور طوعی نظام والے کو سزا دینے کا بھی اختیار رہتا ہے۔ پس اگر تم سزا دو تو تمہیں کوئی قانون اس سے نہیں روکتا۔ قانون تمہیں اس بات سے روکتا ہے کہ تم جبراً کسی کو سزا دو لیکن جو شخص آپ ایک نظام میں شامل ہوتا اور آپ کہتا ہے کہ مجھے بیشک سزا دے لو اُسے سزا دینے میں کوئی قانونی روک نہیں۔ بیشک بعض قسم کی سزائیں ایسی ہیں جنہیں قانون نے روک دیا ہے۔ مثلاً قتل ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے بھی کہے کہ مجھے قتل کر لو تو دوسرا شخص اُسے قتل نہیں کر سکتا۔ یہ صرف حکومت کا ہی کام ہے کہ وہ مُجرم کو قتل کی سزا دے لیکن اِس سے اُتر کر جو معمولی سزائیں ہیں وہ طُوعی نظام میں دی جاسکتی ہیں۔ مدرِّس روز لڑکوں کو پیٹتے ہیں مگر کوئی قانون انہیں اس سے نہیں روکتا۔ اِس لئے کہ طالبعلم اپنی مرضی سے سکول میں جاتا اور وہ اپنی مرضی سے ایک نظام کا اپنے آپ کو پابند بناتا ہے۔ پس جب وہ اپنی خوشی اور مرضی سے ایک نظام کو قبول کرتا ہے تو اُس کا فرض ہے کہ سزا کو بھی برداشت کرے۔ پس تم اپنے اندر اُسی شخص کو شامل کرو جو تمہارے نظام کی پابندی کرنے کے لئے تیار ہو اور جب کوئی شخص اِس اقرار کے بعد

تمہارے نظام میں شریک ہوتا ہے اور پھر کسی عہد کی خلاف ورزی کرتا ہے تو تمہارا اختیار ہے کہ تم اُسے سزا دو۔ پس اگر کوئی جھوٹ بولے تو تم خود اُسے سزا دو اور جس طرح مُرغی اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے اُسی طرح تم سچائی کی حفاظت کرو۔ مُرغی کس قدر کمزور جانور ہے لیکن جب اُس کے بچوں پر کوئی بلّی یا کُتا حملہ کر دے تو وہ بلّی اور کُتا کا بھی مقابلہ کر لیتی ہے۔ پس جس طرح وہ اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے اُسی طرح تم سچ کی حفاظت کرو اور کوشش کرو کہ تمہارا ہر ممبر سچا ہو اور سچائی میں تمہارا نام اِس قدر روشن ہو جائے کہ خدّام الاحمدیہ کا ممبر ہونا ہی اِس بات کی ضمانت ہو کہ کہنے والے نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے اور جب بھی لوگ ایسے شخص کے مُنہ سے کوئی روایت سُنیں وہ کہیں کہ یہ روایت غلط نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اِس کا بیان کرنے والا خدّام الاحمدیہ کا ممبر ہے۔ جب تم اِس مقام کو حاصل کر لو گے تو تمہاری تبلیغ کا اثر اتنا وسیع ہو جائے گا کہ اِس کی کوئی حد ہی نہیں اور تم ہزاروں عیوب قوم میں سے دُور کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ پس دیانت اور سچائی کو خاص طور پر اخلاقِ فاضلہ میں سے چُن لو اور بھی بہت سے ضروری اخلاق ہیں مگر اِن دو اخلاق کو مَیں نے خصوصیت کے ساتھ چُنا ہے۔ اِن کو ہمیشہ اپنے مدّ نظر رکھو اور اِن کے علاوہ بھی جس قدر نیک اخلاق ہیں وہ اپنے اندر پیدا کرو۔ مثلاً اعلیٰ اخلاق میں سے ایک ظلم نہ کرنا ہے مگر چونکہ خدّام الاحمدیہ کے اساسی اصول میں خدمتِ خلق بھی شامل ہے اِس لئے میں نے علیحدہ اِس کو بیان نہیں کیا کیونکہ وہ شخص جس کا فرض یہ ہو کہ وہ دوسروں کی خدمت کرے وہ کسی پر ظلم نہیں کر سکتا۔ پس مَیں نے اِس کو اِسی لئے چھوڑ دیا ہے کہ یہ بات تمہارے نام اور تمہارے اساسی اصول کے اندر شامل ہے لیکن بہرحال اور جس قدر اچھے اخلاق ہیں وہ سب اپنے اندر پیدا کرو۔ انسان اگر تلاش کرے تو اُسے بیسیوں اخلاق معلوم ہو سکتے ہیں لیکن جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے یہ دو اہم اخلاق ہیں جن کا اپنے اندر پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ ایک دیانت اور دوسرا سچ۔

ان کے علاوہ ایک اَور بھی اہم خلق ہے مگر اِس کا ذکر انشاء اللہ پھر کروں گا۔ بہرحال اخلاقِ فاضلہ میں سے سچ اور دیانت کو اپنے اندر پیدا کرنے کی خاص طور پر کوشش کرو اگر تم ان دو اخلاق کو جماعت کے اندر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو تم جماعت کی اتنی بڑی خدمت

کرتے ہو کہ اِس کی قیمت کوئی انسان نہیں لگا سکتا۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی جو عالم الغیب ہے اور جو وسیع سے وسیع گہرائیوں کو ناپ سکتی ہے تمہاری اِس خدمت کا اندازہ لگا سکتی اور تمہیں بڑے سے بڑا بدلہ دے سکتی ہے۔

چونکہ اب وقت زیادہ ہو گیا ہے اِس لئے مَیں اِسی بات کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں۔"

(الفضل ۱۵/ مارچ ۱۹۳۹ء)

۱۔ تِر یا چرِتّر (چلتّر): عورتوں کے مکر و فریب

۲۔ ارشیف ملتقی اهل الحدیث جز ۱ صفحہ ۶۱۴۳، موسوعة خطب المنبر جز ۱ صفحہ ۱۳۵ شاملہ C.D

۳۔

۴۔ سیرت ابن هشام جلد ۲ صفحہ ۲۷۴ مطبوعہ مصر ۱۹۳۶ء

۵۔ السیرة الحلبیة جلد ۲ صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱ مطبوعہ مصر ۱۹۳۵ء (مفہوماً)

۶۔